ماڈیول کی تفصیلات اور اس کا خاکہ

Details of Module and its structure

ماڈیول کی تفصیلات Module Detail	
مضمون کا نام **Subject Name**	اردو **Urdu**
کورس کا نام **Course Name**	آن لائن اردو تدریس کورس برائے ثانوی سطح **Online course for Urdu Teaching at Secondary Stage**
ماڈیول کا عنوان **Module Name/Title**	اردو کے ادبی دبستان، ادارے اور تحریکات **Urdu ke Adabi Dabestan, Idare aur Tahreekat**
ماڈیول آئی ڈی **Module Id**	TUSS_05
مقاصد **Objectives**	اس ماڈیول کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ : 1. اہم ادبی تحریکوں اور رجحانوں سے واقف ہو سکیں گے۔ 2. ادبی تحریکوں کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔ 1. ادبی دبستانوں اور تحریکوں سے وابستہ ادیبوں کے بارے میں جان سکیں گے ۔
کلیدی الفاظ **Keywords**	فورٹ ولیم کالج، جان گلکرسٹ، غازی الدین حیدر، دہلی ورنا کیولر سوسائٹی، دلی کالج، حیدر آباد ایجو کیشنل کانفرنس، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، سر سید احمد خان

ڈیولپمنٹ ٹیم

Development Team

کردار **Role**	نام **Name**	ادارہ **Affiliation**
کورس کوآرڈینیٹر **Course Coordinators**	پروفیسر محمد فاروق انصاری **Prof. Mohd. Faruq Ansari** پروفیسر دیوان حنان خان **Prof. Diwan Hannan Khan**	ڈی ای ایل، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی **DEL, NCERT, New Delhi**
سبجیکٹ میٹر ایکسپرٹ **Subject Matter Expert (SME)**	پروفیسر محمد فاروق انصاری **Prof. Mohd. Faruq Ansari**	ڈی ای ایل، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی **DEL, NCERT, New Delhi**
کورس ایڈمنسٹیٹر **Course Administrator**	ڈاکٹر عزیر احمد **Dr. Uzair Ahmad**	ڈی ای ایل، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی **DEL, NCERT, New Delhi**

فہرست

TABLE OF CONTENTS

فہرست

1۔ تمہید

2۔ دبستانِ دہلی

3۔ دبستانِ لکھنؤ

4۔ فورٹ ولیم کالج

4.1۔ گلکرسٹ

4.2۔ میر امّن

4.3۔ میر بہادر علی حسینی

4.4۔ میر شیر علی افسوسؔ

4.5۔ حیدر بخش حیدری

5۔ قدیم دلّی کالج

6۔ دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد

7۔ ادبی تحریکات ورجحانات

7.1۔ سر سیّد تحریک

7.2۔ انجمنِ پنجاب

7.3۔ اردو ادب میں رومانیت

7.4۔ ترقی پسند تحریک

7.5۔ حلقۂ اَرباب ِذوق

7.6۔ جدیدیت

7.7۔ مابعدِ جدیدیت

8۔ خلاصہ

1۔ تمہید

اردو زُبان وادب کے فروغ اور ارتقا میں مختلف دبستانوں، اداروں اور تحریکات ورجانات کا اہم کردار رہا ہے۔ دبستان، ادارے اور تحریکیں مختلف ادوار میں زُبان وادب کو نئے رویّے، نئے افکار و تصورات اور نئے اسالیب سے متعارف کرانے اور انھیں نئے امکانات اور نئی سمتوں سے روشناس کرانے میں بے حد معاون ثابت ہوئیں۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں ابتدائی دور سے ہی دبستانوں، اداروں اور تحریکوں کی خدمات اور ان کے کارہائے نمایاں کے شواہد ملتے ہیں۔ دبستانوں میں نمایاں طور پر دبستانِ دلّی، دبستانِ لکھنؤ، اداروں میں فورٹ ولیم کالج، قدیم دلّی کالج اور تحریکوں میں سر سید تحریک، انجمن پنجاب، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند)، ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت اہمیت کے حامل ہیں۔

2۔ دبستانِ دہلی

ماضی میں اردو زُبان وادب کو فروغ دینے میں بعض شہروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ شہر تھے جہاں بڑی تعداد میں شاعر اور ادیب جمع ہو گئے تھے اور ان کی سرپرستی کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ان ہی ادبی مراکز میں سے ایک دہلی ہے۔ اردو شاعری کے فروغ میں اس شہر کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں تک کہ اسے ایک باقاعدہ ادبی اسکول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ادبی اسکول کو 'دبستانِ دہلی' کہا جاتا ہے۔

تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یہاں کے مشاہیر شعرا کے ناموں میں : آرزوؔ، آبروؔ، ناجیؔ، یکرنگؔ، مضمونؔ، مرزا مظہر جانِ جاناں، حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ، قائمؔ، میر حسنؔ، میر سوزؔ، جرأتؔ، شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

دبستانِ دہلی کے نمائندہ شعرا کا امتیاز یہ ہے کہ اپنی بات سیدھے سادے اور دل نشیں انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے یہاں عام طور سے تصنع نہیں پایا جاتا۔ ان کی شاعری میں داخلیت زیادہ ہے، خارجیت کم۔ یعنی وہ اپنے جذبات کے اظہار پر زور دیتے ہیں۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ غزل روزِاوّل سے حسن و عشق کے معاملات کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ دہلی کے شعرا نے بھی محبوب کے حسن کی تعریف کی ہے اور ہجر و وصل کے قصّے سنائے ہیں لیکن انھوں نے جذبۂ عشق کا اظہار مہذّب طریقے سے کیا ہے۔ انھیں وصل سے زیادہ ہجر عزیز ہے۔

تصوّف کے مضامین بھی دہلوی شعرا کو بے حد مرغوب ہیں۔ دہلی علما اور صوفیا کا مسکن تھی۔ بعض شاعر خود بھی صوفی تھے۔ جو عملاً صوفی نہیں تھے، وہ بھی صوفیانہ خیالات کو شعر کے لیے موزوں سمجھتے تھے۔ مثلاً دردؔ صوفی شاعر تھے۔ میر تقی میرؔ کی بھی اسی فضا میں تربیت ہوئی تھی۔ دِلّی کی بربادی اور خوف و دہشت کے ماحول نے بھی اردو شاعری میں مضامین تصوّف کو فروغ دیا۔

3۔ دبستانِ لکھنؤ

اورنگ زیب کی وفات (1707) کے بعد ان کے وارثین کے درمیان ہونے والی جنگوں، درباری سازشوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی۔ دہلی بے رونق ہوئی تو فیض آباد اور پھر لکھنؤ کو عروج حاصل ہوا۔

سلطنتِ اودھ کی خوش حالی کا شہرہ سن کر دہلی کے متعدد شاعروں نے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کا رخ کیا۔ جو شاعر پہلے فیض آباد پہنچے تھے وہ بھی بعد میں لکھنؤ آگئے۔ اس طرح لکھنؤ میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک دنیا آباد ہو گئی۔ میر ضاحکؔ، میر سوزؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر حسنؔ وغیرہ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد پہنچ چکے تھے۔ میر تقی میرؔ، جراتؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ میں شعر و شاعری کا آغاز اُن شاعروں کی بدولت ہوا جن کی زندگی کا بڑا حصّہ دہلی میں گزرا تھا۔ وہ شاعری میں اپنی پرانی روش پر قائم رہے۔ لیکن وہ لوگ جو کم عمری میں فیض آباد یا لکھنؤ آئے تھے یا جنھوں نے فیض آباد یا لکھنؤ میں ہی آنکھیں کھولی تھیں، جب انھوں نے شاعری شروع کی تو دہلی کے مقابلے ایک نیا لب و لہجہ، نئی فکر اور نئے اسالیبِ شعر سامنے آئے۔ یہیں سے دبستانِ لکھنؤ کا آغاز ہوتا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ کے اہم شاعروں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں رنگینؔ، انشاؔ اور جراتؔ اور ان کے بعد آنے والوں میں آتشؔ اور ناسخ اہم ترین ہیں۔ امام بخش ناسخ دبستانِ لکھنؤ کے سب سے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان سے دبستانِ لکھنؤ کو استحکام حاصل ہوا۔ اسی دور میں زبان کی اصلاح ہوئی۔ متروکات کی فہرست سازی ہوئی۔ شاعری کے نئے اصول و ضوابط مقرر ہوئے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد علی اوسط رشکؔ کی

خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔رشکؔ کے علاوہ بحرؔ،وزیرؔ،منیرؔ،برقؔ وغیرہ کا شمار ناسخؔ کے مشہور شاگردوں میں ہوتا ہے۔آتشؔ کے شاگردوں میں پنڈت دیاشنکر نسیمؔ،رندؔ،صباؔ،شوقؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لکھنؤ کی خوش حالی اور عیش و عشرت کی زندگی نے شعر وادب کو بھی متاثر کیا۔شاعری میں نشاطیہ لب ولہجہ عام ہوا۔داخلیت پر خارجیت کو غلبہ حاصل ہوا۔اعضاے بدن ہی نہیں،لباس اور زیورات کی تفصیلات بھی رقم ہونے لگیں۔نازک خیالی اور زبان کی شیرینی پر زور دیا گیا۔شعری صنعتوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہونے لگا اور رعایتِ لفظی کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی۔لکھنؤ میں غزل کے علاوہ جن اصنافِ سخن پر خاطر خواہ توجّہ دی گئی ان میں مرثیہ،مثنوی،قصیدہ،ریختی اور واسوخت قابلِ ذکر ہیں۔

4۔فورٹ ولیم کالج: (1800)

اٹھارھویں صدی کے آخر تک انگریز جنوبی ہندوستان پر بھی قابض ہوگئے۔ اب وہ پورے ہندوستان پر حکومت قائم کرنے کے منصوبے کے مطابق حکمتِ عملی تیار کرنے لگے۔

انگریز اس حقیقت سے واقف تھے کہ تجارت کے فروغ اور ملک پر حکمرانی کے لیے یہاں کی زُبان،طور طریقوں،رسم ورواج اور قاعدے قانون سے واقفیت ضروری ہے۔اس وقت حکومت کی زبان فارسی تھی۔لیکن عوامی سطح پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی۔انگریز گورنر جنرل ویلزلی نے یہ محسوس کیا کہ انگلینڈ سے آنے والے نئے حکام اور عام ملازمین دیسی زبانوں سے واقف ہوں تو یہاں کے مالی اور فوجی انتظامات بہتر طور پر سنبھالے جا سکتے ہیں۔چنانچہ 4 مئی 1800 کو ایک مستقل تعلیمی ادارہ 'فورٹ ولیم کالج' کا قیام عمل میں آیا۔ویلزلی نے کالج میں کئی شعبے قائم کیے اور لائق اساتذہ کا تقرر کیا۔ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو ہندوستانی زبان کے شعبے کا صدر منتخب کیا گیا۔گلکرسٹ نے زبان کے مسائل میں گہری دل چسپی لی۔انھوں نے نہ صرف خود تصنیف و تالیف کا کام کیا بلکہ اس عہد کے کئی نامور نثر نگاروں کی خدمات حاصل کیں اور ان سے ایسی کتابیں ترجمہ،تصنیف وتالیف کرائیں جن میں سے اکثر آج بھی اہمیت رکھتی ہیں۔

ان نامور قلم کاروں میں میر امّن،حیدر بخش حیدری،کاظم علی جوانؔ،مرزا علی لطفؔ،شیر علی افسوسؔ،میر بہادر علی حسینی،مظہر علی خاں ولاؔ اور للّو لال جی قابلِ ذکر ہیں۔ان ادیبوں کی تصانیف میں میر امّن کی 'باغ وبہار' کا نام سرِ فہرست ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی شائع کردہ کتابوں سے ایک طرف جدید نصابی ضرورتوں کا تصوّر ذہن میں روشن ہوا تو دوسری طرف سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی مضبوط روایت قائم ہوئی۔ اس کی بدولت اردو نثر فارسی آمیز اور پُر تصنع اسلوب سے نکل کر جدید دور میں داخل ہوئی۔ گلکرسٹ نے چھاپے کے لیے اردو ٹائپ کا مَطبَع قائم کیا جس سے اردو کتابوں کو شائع کرنے کا چلن عام ہوا۔

فورٹ ولیم کالج میں درسی کتابوں کو چھاپتے وقت کتابوں میں مشقیں، فرہنگیں، تعارفی نوٹ اور ضروری حاشیے بھی درج کیے جاتے تھے۔ صحیح تلفّظ کے لیے اعراب یعنی، زبر، زیر، پیش کا استعمال کیا گیا۔ دو لفظوں کے درمیان فاصلہ، دو مصرعوں کی ترتیب، پیراگراف، واوین اور کاما وغیرہ سے فقروں کو واضح کرنے کا طریقہ رائج ہوا۔ کالج نے طباعت و اشاعت میں نئے نئے تجربے کیے۔ نصابی کتابوں کی تیاری، پرانی کتابوں سے انتخاب، املا اور اسلوبِ نثر کی معیار بندی اور صحیح طباعت کی جانب توجہ دی گئی۔ 'باغ و بہار'، 'مثنوی سحر البیان' اور 'کلیاتِ میر' کی طباعت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

4.1۔ گلکرسٹ (1841-1759)

فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے پہلا نام ڈاکٹر جان بارتھوک گلکرسٹ کا سامنے آتا ہے۔ گلکرسٹ 1800 میں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ہندوستانی انگریزی لغت، ہندوستانی علم اللسان، اردو صرف و نحو اور مشرقی زبان دانی جیسے موضوعات پر مشتمل تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے تصنیف، تالیف، طباعت، ترجمہ اور املا وغیرہ میں جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اردو زبان کو بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا۔

4.2۔ میر امّن (1837-1750)

اسی سلسلے کا دوسرا اہم نام میر امّن کا لیا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے نصفِ آخر میں جب دہلی سلطنت کی بنیادیں ملنے لگیں اور ان کی جاگیر ضبط ہو گئی تو وہ دہلی چھوڑ کر پہلے عظیم آباد آئے اور پھر کلکتہ پہنچے۔ منشی میر بہادر علی حسینی کے توسط سے گلکرسٹ تک ان کی رسائی اور 4 مئی 1801 کو فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے میں منشی مقرر ہوئے۔ میر امّن جون 1806 تک اس کالج میں رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے دو کتابیں 'باغ و بہار' اور 'گنجِ خوبی' تالیف و ترجمہ کیں۔ انھیں شہرت 'باغ و بہار' سے ملی جس میں چار درویشوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ میر امّن نے باغ و بہار میں دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کر کے اردو

نثر نگاری میں سادہ اسلوب کی بنیاد ڈالی۔ ان کی دوسری کتاب 'گنجِ خوبی' ہے جو ملا واعظ کاشفی کی فارسی کتاب 'اخلاقِ محسنی' کا اردو ترجمہ ہے۔

4.3۔ میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی کا تعلق بھی دلّی سے تھا۔ وہ 1801 سے 1808 تک فورٹ ولیم کالج میں رہے۔ گل کرسٹ نے ان کی لیاقت کی بڑی تعریف کی ہے۔ انھوں نے 'نثرِ بے نظیر' کے نام سے 'مثنوی سحر البیان' کا خلاصہ، 'اخلاقِ ہندی' کے عنوان سے، سنسکرت کی مشہور کتاب 'ہِتوپدیش' کا ترجمہ، 'نقلیات' کے نام سے، دو جلدوں میں کہانیوں کا مجموعہ اور 'رسالہ گل کرسٹ' کے نام سے گل کرسٹ کی قواعد کا اردو میں خلاصہ شائع کیا۔ اِن کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کی تیاری میں بھی ان کا تعاون شامل رہا ہے۔

4.4۔ میر شیر علی افسوسؔ (1809-1732)

فورٹ ولیم کالج کے ہی حوالے سے ایک اور نام میر شیر علی افسوس کا ہے۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج میں مترجم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کے ذمے ترجمے کے ساتھ ساتھ مسوّدات کی تصحیح کا کام بھی تھا۔ ان کی مشہور کتابوں میں 'گلستاں' کا اردو ترجمہ 'باغِ اردو' ہے۔ سجان رائے بھنڈاری کی فارسی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ انھوں نے 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا۔

4.5۔ حیدر بخش حیدری (1768/69-1813/14)

حیدر بخش حیدری کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا شمار کالج کے اہم نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ اس کالج کے مصنفوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات کی تعداد تیرہ ہے۔ انھوں نے فارسی قصہ 'حاتم طائی' کا ترجمہ 'آرائشِ محفل' کے نام سے کیا جو میر امّن کی 'باغ و بہار' کے بعد سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'طوطا کہانی' ہے جو سید محمد قادری کے فارسی 'طوطی نامہ' کا ترجمہ ہے۔ ان کے علاوہ 'قصہ مہر وماہ'، 'قصہ لیلیٰ مجنوں'، 'گلدستہ حیدری'، 'گلشنِ ہند'، 'گلزارِ دانش'، 'ہفت پیکر' وغیرہ کتابیں بھی لکھیں۔

5۔ قدیم دلّی کالج (1825)

انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے بعد انگریزوں کا قائم کردہ دوسرا بڑا تعلیمی و تصنیفی ادارہ 'دلّی کالج' تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد انگریز سول اور فوجی ملازمین کو ہندوستانی زبان بالخصوص

اردو سکھانا تھا۔اس کے برعکس دلّی کالج ہندوستانی نوجوانوں میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم اور انگریزی زبان کو عام کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔ 1825 میں غازی الدین حیدر کے مدرسے میں 'دلّی کالج' کا قیام عمل میں آیا۔

دلّی کالج میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم و تدریس کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔کئی لائق اور باصلاحیت اساتذہ رکھے گئے تھے۔تین سال بعد انگریزی کا شعبہ قائم ہوا۔ 1830 میں جب اعتمادالدولہ نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے کی رقم اس کالج کے لیے وقف کی تو اس کی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔نئے نصاب مرتّب ہوئے۔درسی کتابیں تیار کی گئیں۔ترجمے کے کام میں تیزی آئی۔طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا۔کچھ ہی برسوں میں دلّی کالج نے ایک اہم تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل کرلی۔

اس دور کے کئی نامور ادیب اور شاعر اس سے وابستہ ہوگئے۔ان میں مولانا صدرالدین آزردہؔ اور امام بخش صہبائیؔ بھی شامل تھے۔ان ادیبوں نے دلّی کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔سالانہ مشاعرے کا انعقاد اور ادبی بحث و مباحثہ کا دور شروع ہوا۔

کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اعلیٰ درجے کی علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔اس مقصد کے تحت 1843 میں 'دہلی ورنا کیولر سوسائٹی' قائم ہوئی۔اس سوسائٹی نے سائنس، ریاضی، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات سے متعلق انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے کرائے۔ اصطلاح سازی اور ترجمے کے اصول مرتّب کیے گئے۔

کالج کے اساتذہ نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کو کالج تک محدود نہ رکھا بلکہ اخبارات اور رسائل کے ذریعے ملک بھر میں پھیلایا۔کالج کے لائق استاد ماسٹر رام چندر کی ادارت میں نکلنے والے اخبار 'فوائد الناظرین' اور رسالہ 'محبِّ ہند' میں مختلف مضامین کے ساتھ یورپ کی ترقیات اور ایجادات کی تفصیلات بھی شائع ہوتی تھیں۔اخبار میں جدید تقاضوں کے تحت ادبی، سیاسی، سماجی اور اصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

دلّی کالج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور سائنس، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، قانون، طب، منطق فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔اس کی بدولت اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔اردو زبان میں نئی نئی اصطلاحات اور الفاظ شامل ہوئے۔دلّی کالج نے کئی روشن خیال علمی و ادبی شخصیتوں کو پیدا کیا۔ان میں ماسٹر رام چندر، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی مملوک علی

نانوتوی، پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ، محمد حسین آزاد، مولوی ضیاءالدین، سید ناصر علی اور مدن گوپال کے نام قابل ذکر ہیں۔

6۔دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد(1917)

دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد کا شمار بیسویں صدی کے اہم تصنیفی اداروں میں ہوتا ہے۔اس کے قیام کا بنیادی مقصد سائنس اور دوسرے علوم وفنون کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے بعد 'حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد رکھی گئی۔ سر اکبر حیدری کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی علمی وادبی کوششوں سے ایک نیا شعور پیدا ہوا۔ نظام نے علم وادب کی ترقی میں خاص دلچسپی لی۔اس وقت حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی، اس لیے ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی جہاں اردو میں اعلیٰ تعلیم دی جاسکے۔سب سے بڑا مسئلہ اردو میں نصابی کتابوں کی دستیابی کا تھا۔اسی مقصد کے تحت عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے 1917 میں تالیف وترجمہ کا شعبہ قائم کیا گیا جسے 'دارالترجمہ' کہتے ہیں۔دارالترجمہ میں اصطلاحات اور ترجمے کے کام کو بخوبی انجام دینے اور نصابی کتب کی تیاری کے لیے کئی کمیٹیاں بنائی گئیں ۔

7۔ادبی تحریکات ورجحانات

آیئے اب اردو کی ادبی تحریکات اور ادبی رجحانات کا ذکر کیا جائے۔آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام ادبیات اپنے عہد اور حالات کے تحت تبدیلی اور تغیر کو قبول کرتی ہیں، یہ زندہ زبان وادب کی شناخت بھی ہے۔اردو کا بھی شمار دنیا کی اُن ادبیات میں ہوتا ہے جس کے دامن میں صدیوں کی تہذیبی روایات اور تاریخ موجود ہے۔اردو نے ہمیشہ معاشرے کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی راہوں کو اپنایا ہے۔گاہے بگاہے رونما ہونے والی تحریکات اور رجحانات کو اپنایا ہے جس کے سبب اردو کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

7.1۔سرسیّد تحریک

سرسید تحریک کا سب سے اہم مقصد جدید تعلیم کا فروغ تھا۔علمی تحریک کا یہ سلسلہ 'سائنٹفک سوسائٹی' سے شروع ہوتا ہے۔یہ سوسائٹی 1864 میں غازی پور میں قائم ہوئی۔اس کا مقصد تھا کہ مختلف مغربی علوم کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ جدید علوم سے واقفیت عام ہو سکے۔سوسائٹی نے پندرہ کتابوں کے اردو ترجمے شائع کیے۔اس کے علاوہ ایک اخبار 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے جاری

کیا۔ سرسید نے 1875 میں علی گڑھ میں 'محمڈن اینگلواورینٹل کالج' قائم کیا۔ جب کالج کے کاموں میں سرسید زیادہ مصروف ہوگئے تو سوسائٹی کی سرگرمیاں کم ہوتی گئیں۔ آخر اسے کالج کمیٹی میں ضم کردیا گیا۔ انھوں نے 1886 میں 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' قائم کی۔ ملک کے مختلف شہروں میں اس کے جلسے ہوا کرتے تھے جن میں جدید تعلیم کے حصول پر زور دیا جاتا تھا۔

سرسید تحریک کا دوسرا اہم مقصد معاشرے کی اصلاح تھا۔ چنانچہ سرسیّد نے حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے پر بھی زور دیا۔ انھوں نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا اور اس میں معاشرتی و اصلاحی موضوعات پر مضامین شائع کیے جانے لگے۔

سرسید کی ان تعلیمی اور اصلاحی خدمات سے اردو زبان و ادب کو بھی فیض پہنچا۔ سرسید کے عہد سے پہلے علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے یا تو فارسی زبان استعمال کی جاتی تھی یا اردو کی دقیق اور پیچیدہ نثر۔ سرسید نے اردو میں سادہ اور بے تکلف علمی نثر کو رواج دیا۔ 'تہذیب الاخلاق' میں جن علمی، اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر مضامین لکھے گئے وہ اردو میں نئے تھے۔ ان مسائل و مباحث کے لیے ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کی بھی ضرورت تھی۔ سرسیّد نے اس نئے اندازِ تحریر کو خود ایجاد کیا۔ سادگی اور بے تکلفی اس طرزِ تحریر کی خوبی ہے۔ سرسید کی بدولت اردو نثر علمی اور سائنسی موضوعات پر اظہارِ خیال کے قابل بن گئی۔

سرسید کو اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے ضمن میں ایسے باکمال رفیق اور ساتھی ملے جنھوں نے اردو نثر کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے استحکام بخشا۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزادؔ، مولوی چراغ علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور مولوی ذکاءاللہ کے نام شامل ہیں۔

سرسید تحریک کی خدمات تاریخی، سماجی اور ادبی ارتقا کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس تحریک نے بیداری کے اس دور کا آغاز کیا جس کی بدولت ادب کا رشتہ زندگی سے مستحکم ہوگیا نیز صحت مند اور توانا اسالیب وجود میں آئے جو ادب، سماج اور تہذیب کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ بن گیا۔

7.2۔ انجمنِ پنجاب (1865)

1857 میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور سارے ملک پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ دہلی اور لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد بعض ادیب و شاعر ہجرت کر کے لاہور پہنچے۔ ان میں محمد حسین آزادؔ، منشی پیارے لال آشوبؔ، مولوی سید احمد دہلوی، مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

لاہور اس وقت علم و ادب کی سر گرمیوں کا ایک اہم مرکز تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل جی، ڈبلو لائٹنر (Dr. G. W. Lietnor) مشرقی علوم میں گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے حکومتِ پنجاب کے ایما پر 21، جنوری 1865 کو 'انجمنِ مطالبِ مفیدۂ پنجاب' قائم کی جسے عام طور پر 'انجمنِ پنجاب' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اس کا صدر بنایا گیا۔ انجمن کے سرپرست اور محرّک اصلاً کرنل ہالرائڈ تھے لیکن اس کے منصوبوں کو عملی شکل ڈاکٹر لائٹنر نے دی۔

محمد حسین آزاد کی وابستگی کے بعد انجمن پنجاب کو نئی تحریک اور توانائی ملی۔ لائٹنر کے بعد آزادؔ کو انجمن کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ کرنل ہالرائڈ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، پنجاب کی کوششوں سے 8 / مئی 1874 کو ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس میں حالیؔ کا تعاون بھی شامل تھا۔ انجمن نے ملک کی تعلیمی ضرورتوں کے پیشِ نظر تصنیف و تالیف اور ترجمے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ انجمن پنجاب اردو نظم نگاری میں ایک نئے رجحان کی ابتدا ہوئی۔ ادب اور زندگی کے رشتوں کا احساس پیدا ہوا۔ بلاشبہ اس انجمن نے اردو شاعری کو ایک نئی فکر دی جو بعد میں جدید شاعری کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔

7.3۔ اردو ادب میں رومانیت

رومانیت کو عام طور پر رومان اور عشق کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح یوروپ کے توسط سے اردو میں آئی۔ یورپی ادب میں حقائق پر یقین کے باوجود اُس کے پرے جانے اور خواب و خیال کو زندگی کی بنیادی خواہش کے طور پر راہ نما بنانے کی روایت کو رومانیت کہتے ہیں۔ اس کا ایک مظہر عشق اور حسن ہو سکتے ہیں لیکن رومانیت کی دنیا اس سے بہت بڑی ہے۔

رومانیت تخیل کے سہارے ادب میں اپنی دائمی جگہ بنا لیتی ہے۔ تخلیق میں ادبی حُسن کی تلاش اصل میں رومانوی اندراجات پر غور کرنا ہے۔

اردو میں رومانیت انگریزی کی طرح کوئی تحریک یا ادب کا کوئی مقبول رویہ نہیں رہی۔ رومانیت کی روح اور تغزل کے دائرہ کار میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اس وجہ سے اردو کے غزل گو شعرا کے لے ی رومانی تصورات کو الگ سے آزمانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اردو کی ادبی تاریخ میں دور جدید سے پہلے رومانی عناصر کی تلاش آسان نہیں ہے۔ شاعری میں یہ کام تغزل کے اوصاف سے لے د جا رہے تھے لیکن نثر میں سب رس (ملا وجہی)، نوطرز مرصع (عطا حسین تحسین) اور فسانۂ عجائب (مرزا رجب علی بیگ سرور) ایسی کتابیں ہیں جن کی زبان رومانیت کے بنیادی تصورات سے ہم آہنگ ہے۔

انیسویں صدی میں محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی اردو کے دو ایسے انشا پرداز سامنے آئے جن کا مزاج رومانی تھا۔ آبِ حیات، اور نیرنگ خیال (محمد حسین آزاد)، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر اور الغزالی (شبلی نعمانی) اردو کی ایسی کتابیں ہیں جن کی نثر کا بنیادی ڈھانچا رومانی ہے۔ دونوں ادیبوں کے مزاج کی سیمابیت اور تخیلات کی طرف جھکاؤ بھی رومانی ہے۔ ان دونوں اہل قلم نے تاریخ کے زیر سایہ اپنی جو پناہ گاہ تلاش کی، وہ بھی رومانی اندازِ فکر کا نمونہ ہے۔

7.4۔ ترقی پسند تحریک (1936)

اردو ادب میں سر سید تحریک کے بعد یہ سب سے بڑی ادبی تحریک تھی، جس کا مقصد ادب کو سماج سے جوڑنا تھا۔ لندن میں مقیم چند نوجوان ہندوستانی طلبا نے 1935 میں 'ترقی پسند مصنفین کی انجمن' قائم کی۔ ملک راج آنند کو اس انجمن کا صدر مقرر کیا۔ تحریک کا ایک منشور تیار کیا گیا جس پر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے دستخط کیے۔

ان نوجوانوں میں بدلتے ہوئے دور کا احساس پہلے ہی سے موجود تھا۔ 1932 میں 'انگارے' نام کی کتاب شائع ہوئی جن میں شامل افسانوں میں توہم پرستی، بداعتقادی، اندھی تقلید اور رجعت پسندی کے خلاف احتجاج تھا۔ یکم اپریل 1936 کو لکھنؤ میں ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی کانفرنس ہوئی، جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے جو خطبہ دیا وہ بہت مشہور ہوا۔ اپنے خطبے میں انھوں نے ترقی پسندی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا:

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

ترقی پسند تحریک نے جہاں ادب کے معیار کو بدلا اور بلند کیا وہیں اس نے سماج سے گہرے رشتے استوار کیے۔ غریبوں، مظلوموں، سماج کے دبے کچلے لوگوں کے استحصال اور ان کی حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی۔ ملک کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو نظم کو نئی منزلوں اور بلندیوں تک پہنچایا۔ ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف میں کئی نئے انقلابی مسائل اور موضوعات کو جگہ دی۔ اس طرح ہمارے ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

ترقی پسند شعرا میں فیض احمد فیضؔ، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اخترؔ اور احمد ندیم قاسمی کے نام اہم ہیں۔ فکشن نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کی خاص اہمیت ہے۔ سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد اور انتظار حسین کے افسانوی فن کی شناخت اسی دور میں قایم ہوئی لیکن اپنے رویوں میں یہ ترقی پسند نہیں تھے۔

7.5۔ حلقۂ اربابِ ذوق

حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام 16، اکتوبر 1939 کو لاہور میں عمل میں آیا۔ پہلے اس کا نام 'بزمِ داستان گویاں' تھا۔ اس کے تحت ادبی نشستیں منعقد ہوتی تھیں جن میں شعری اور افسانوی ادب پر جدید مغربی تنقیدی تصورات کے تحت بحث کی جاتی تھی۔ اس بزم کے ادبی گروہ میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا اور بعد میں اس بزم کا نام 'حلقۂ ارباب ذوق' ہو گیا۔ 'ترقی پسند تحریک' اور 'حلقۂ ارباب ذوق' دونوں تنظیمیں ایک ہی دور میں ادبی منظر نامے پر ظاہر ہوئیں۔ اپنے ادبی نظریات کے اعتبار سے یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ترقی پسند تحریک 'ادب برائے زندگی' پر زور دیتی ہے جب کہ 'حلقۂ ارباب ذوق'، 'ادب برائے ادب' پر اصرار کرتا ہے۔

حلقہ کی بنیاد ڈالنے والوں میں حفیظ ہوشیارپوری، شیر محمد اخترؔ، تابش صدیقی، محمد افضل اور سید نصیر احمد شاہ کے نام اہم ہیں۔ بعد میں میراجی اور ن۔م۔راشد کی شمولیت ہوئی۔ ان دونوں نے مل کر 'حلقۂ ارباب ذوق' کے اغراض و مقاصد طے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ میراجی اور ن۔م۔راشد کے علاوہ جن

لوگوں نے 'حلقۂ اربابِ ذوق' کے مقاصد عام کرنے میں اہم رول ادا کیے ان میں قیوم نظر، مختار صدیقی، یوسف ظفر اور ضیا جالندھری وغیرہ کی خاص اہمیت ہے۔

7.6۔جدیدیت

جدیدیت ایک رجحان ہے۔ بعض نقّادوں نے اسے تحریک بھی کہا ہے۔ جدیدیت کو ایک مسلسل میلان کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ہر دور میں اس کی پہچان کے عناصر مختلف رہے ہیں۔ جدیدیت کے اوّلین سرے علامت نگاری کے اس رجحان سے ملتے ہیں جس کے آغاز و ارتقا کا تعلق مغرب میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر سے ہے۔ علامتی رجحان نے تخلیقی زبان کا ایک نیا تصور دیا تھا۔ روایت شکنی بھی کی گئی اور روایت کو نئے معنی بھی دیے گئے۔ اسلوب وہیئت کی نئی صورتیں وضع ہوئیں جو انفرادی تجربے کی مظہر تھیں۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک بڑے زور وشور کے ساتھ جاری رہا۔ جب کہ ہمارے یہاں اس کے آثار 1955 کے بعد سے ملتے ہیں۔ جدیدیت نے صرف شاعری، افسانوی ادب اور ڈراما وغیرہ ہی پر گہرے اثرات قائم نہیں کیے بلکہ مصوّری، موسیقی اور عمارت سازی جیسے فنون پر بھی اُس نئے تخلیقی ذہن کی کارکردگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے جسے جدید کہا جاتا ہے اور جس کی حسیت بھی جدید کہلاتی ہے۔

جدیدیت نے ہیئت و موضوع کی وحدت اور تخلیقی زبان پر زور دیا اور اس امر پر بھی اصرار کیا کہ تخلیقی زبان کثرتِ معنی کی حامل ہوتی ہے۔ اور کثرتِ معنی سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ ابہام، حیرت ہی کا موجب نہیں ہوتا، مزید جاننے کے لیے ہماری جستجو کو سرگرم بھی رکھتا ہے۔ جدیدیت کے فکری سلسلے وجودیت سے ملتے ہیں۔ جدیدیت نے ذات کے تجربے، فرد کی اہمیت اور انفرادی آزادی جیسے تصورات وجودیت ہی سے اخذ کیے ہیں۔ اجنبیت، بے گانگی اور تنہائی کے احساس نے ذات کے اسی تجربے سے نمو پائی ہے۔ اکثر ادیبوں نے قدروں کے بحران کو بھی خاص عنوان دیا ہے۔ جدید ادب میں یہ موضوعات حاوی رجحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں خلیل الرحمن اعظمی، عمیق حنفی، شفیق فاطمہ شعریٰ، قاضی سلیم، محمد علوی، بلراج کومل، شہریار، عادل منصوری، زبیر رضوی، ندا فاضلی، باقر مہدی اور وحید اختر کی شاعری نئے انسان کے باطنی اضطراب کی مظہر ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جو جدیدیت کے نمائندہ کہلاتے ہیں۔

7.7۔مابعدِ جدیدیت

ادبی رجحانات کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ادب کا شعبہ ہمیشہ نت نئی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ تبدیلی زندگی ہی نہیں ادب کا بھی تقاضہ ہے۔ادب میں جب کوئی چھوٹی یا بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی محض یک طرفہ یا ادب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ علم اور زندگی کے دوسرے بہت سے شعبوں میں بھی اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔جدیدیت ایک ثقافتی صورتِ حال تھی جس نے لفظ و معنی اور ان کے باہمی رشتے پر نئے سرے سے غور کرنے پر اُکسایا تھا۔اردو میں 1955-60 سے تقریباً 1980 سے 85 تک جدیدیت ایک حاوی رجحان کی حیثیت سے تخلیقی فن کاروں کی دل چسپی کا خاص موضوع تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ مابعد جدیدیت کے رجحان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل مابعدِ جدیدیت بھی ایک نئی ثقافتی صورتِ حال کی مظہر ہے۔

8۔ خلاصہ

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ دبستان کے طور پر دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے حالانکہ دوسرے ادبی مراکز بھی رہے ہیں لیکن ان کی حیثیت دبستان کی نہیں بن سکی۔ اسی طرح فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور دارالترجمہ عثمانیہ نے اردو کی درسی اور نصابی کتابوں کے ترجمے اور ترتیب کی راہ ہموار کی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادب کی افہام و تفہیم اور اس کی تدریس کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام تحریکوں اور رجحانوں کو ذہن میں رکھا جائے۔ دراصل ان تحریکات و رجحانات نے ادب کو وقت کے تقاضے اور مطالبے سے روبرو کرایا۔انہیں کے سبب اردو ادب نے خود کو معاشرے کے دوش بدوش رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ادب میں اس طرح کی تحریکیں مستقبل میں بھی آتی رہیں گی۔

***

Disclaimer:

آن لائن کورس کے درسی مواد کی ترتیب وتدوین کے لیے این سی ای آر ٹی کی درسی و معاون درسی کتابوں 'اردو زبان وادب کی تاریخ' ، 'اردو قواعد وانشا'، 'اردو کی ادبی اصناف'، 'رہنما کتاب'، 'اردو تدریسیات'، 'اردو زبان کی تدریس' وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔